بنیاد، جلد ۱۴، ۲۰۲۳ء

فیصل ریحان*

انور رومان: بلوچستان میں نثری نظم کا پہلا شاعر

Anwar Rumaan: Pioneer of Prose Poetry in Baluchistan

Abstract:

Anwar Rumaan (1924-2013) was a well-known academician, historian, poet, and translator from Baluchistan. However, few people know that he had also written short stories, dramas, and prose poems in Urdu. He composed and published prose poems in the late 60's of 20th century, a period when fewer literati were trying their hand in the genre of prose poem. It was Rumaan who was frequently offering examples of prose poetry in Urdu and Pashto, hence uncontestably pioneering prose poem in Pakistan. Unfortunately, Anwar Rumaan's literary achievements have not been recognized, discussed, and not even mentioned by the Urdu critics and researchers. This article not only discusses his poetry in detail for the first time but also claims that he was the first Urdu prose poet from Baluchistan. It also highlights significant features of his individual talent, along with the cultural and social influence of the region of Baluchistan got seeped across his oeuvre. Furthermore, his poetry in Punjabi and Pashto languages testifies that he was a bilingual prose poet too, a rare case indeed.

Keywords: Anwar Rumaan, Faiz Ahmad Faiz, Sajjad Zaheer, Mubarak Ahmad, Baudelaire, Baluchistan, Drama, History, Pashto, Urdu, *Naśri Naẓm. Ānwāriyē, Qumqumē.*

نثری شاعری کی روایت خاص قدیم ہے۔ بعض لوگ اس کا ماخذ ہندی ویدوں کو قرار دیتے ہیں[۱]۔ اردو میں بھی قریب قریب ایک سو سال سے نثری نظم لکھی جا رہی ہے، تاہم معاصر ادبی منظر نامے پر اسے جو مقبولیت اور قبولیت (دونوں میں فرق ہے اور نثری نظم اب ہر دو سے مستفید ہو رہی ہے) ملی ہے ماضی قریب میں اس کا تصور محال تھا؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل تک اردو کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں اسے بہ طور ایک شعری صنف کے قبولیت کے مسئلے کا سامنا رہا۔ اردو ناقدین نے اپنی تحریروں میں اس کی

ہیئت، تکنیک اور اس کے نام کی بہ ظاہر الجھی ہوئی ترکیب یعنی ''نثری نظم'' کے حوالے سے سوالات اٹھائے ہیں۔ ناصر عباس نیّر نے نثری نظم کی وجہ نزاع اس کی شعریات کی بجائے اس کی تنقید کو قرار دیتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے کہ اس کے تنقیدی کلامیے کی توجہ اس کے ''اسمیاتی اصل'' پر رہی ہے[۲]۔ امر واقعہ یہی ہے کہ ابتدا میں اردو میں نثری نظم کو ادبِ لطیف، انشائے لطیف، شاعرانہ نثر اور شعر منثور ایسے مختلف ناموں سے پکار کر اس کی صنف کو متنازعہ بنا دیا دیا گیا، اور یوں اردو تنقید کی ساری توجہ نثری نظم کی ساخت اور شعریات کی بجائے اس کے نام کے مباحث پر مرکوز رہی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب ساٹھ کی دہائی میں اردو میں نثری نظم ایک تحریک کی صورت سامنے آئی، اس وقت بھی چند ایسے شاعر جو مرکز سے دور رہ کر نثری نظمیں تخلیق کر رہے تھے، اپنی اہم اور قابل ذکر شاعری کو محض ''انشائے لطیف'' کے زمرے میں رکھتے ہوئے آخر تک خود کو شاعر کہلانے میں متامل رہے۔ اسی وجہ سے اپنی اہم تخلیقات کے باوصف وہ ناقدین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے، نہ ان کا ذکر نثری نظم کی روایت میں ملتا ہے۔

ایسا ہی ایک اہم اور یک سر نظر انداز نام انور رومان (۱۹۲۴ء-۲۰۱۳ء) کا ہے جو ساٹھ کی دہائی میں کوئٹہ اور صوابی میں رہتے ہوئے نثری نظمیں تخلیق کرتے رہے، مگر ان کا ذکر اردو نثری نظم کے کسی تنقیدی یا ارتقائی مطالعے میں نہیں ملتا۔ بلوچستان میں بھی اردو شاعری کی روایت سے متعلق لکھے گئے مضامین اور کتب میں ان کا ذکر یا تو سرے سے ملتا نہیں، یا بعض جگہ فقط ایک آدھ جملے میں محض اطلاعی خبر کے طور پر ان کا نام آ جاتا ہے[۳]۔ بلوچستان کی جس پہلی کتاب میں انور رومان کا مختصر ذکر بہ طور شاعر مع نظمیہ مثال کے ملتا ہے۔ وہ ان کے بھائی انعام الحق کوثر (۱۹۳۰ء-۲۰۱۴ء) کی کتاب بلوچستان میں تذکرۂ اردو (۲۰۰۶ء) ہے، جو فقط اس قدر ہے، ''انور رومان کی دو کتابیں انواریے اور قمقمے کا بیشتر حصہ نثری نظموں پر مشتمل ہے''[۴]۔ ان کے بعد علی کمیل قزلباش (پ:۱۹۶۷ء) نے انور رومان کی نثری نظموں کی تحسین مختصراً ان الفاظ میں کی ہے۔ ''انور رومان کا اگرچہ بہت کم شعر امیں ذکر ملتا ہے، لیکن ان کی نثری نظمیں خیال کی چاشنی اور ندرت کے باعث دل کشی سے خالی نہیں''[۵]۔ دستیاب شواہد کے مطابق ان دو حضرات کے علاوہ کسی طبع شدہ کتاب یا مضمون میں انور رومان کی نظموں کا ذکر نہیں ملتا۔ گویا اب تک ان کی نثری نظموں کا تفصیلی تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا گیا۔

اس مقالے کا ایک اہم مقصد اس اہم مگر فراموش کردہ شاعر کو نہ صرف ادبی منظر نامے اور نثری نظم کے مباحث کا حصہ بنانا ہے، بلکہ دستیاب شواہد سے یہ ثابت کرنا ہے کہ انور رومان کا نام نثری نظم کے اوّلین دو چار شعرا میں شامل ہے۔ یہ تحقیق کا بنیادی فریضہ ہے؛ اس کے ساتھ ساتھ انور رومان کے فکر و فن کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے شعری رجحانات اور موضوعات کا مطالعہ کرنا ہے، نیز یہ دیکھنا ہے کہ آیا ان کی نثری نظمیں صرف تاریخی حوالے کی بنا پر اہمیت رکھتی ہیں یا ان نظموں کے متن میں ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو مستقل ادبی قدروں کی حامل ہیں اور یوں انور رومان اپنے فکری اور فنی تخصص کے باعث اپنے معاصرین

کے ساتھ ساتھ نثری نظم کی روایت میں ایک اہم اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

انور رومان کا اصل نام محمد انور ہے، وہ ۱۹۲۴ء میں مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر (انڈیا) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔اے کرنے کے بعد وہ کوئٹہ کے سنڈیمن ہائیر سیکنڈری سکول میں لیکچرر تعینات ہو کر بلوچستان آ گئے، اور قیام پاکستان کے بعد انھوں نے کوئٹہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہ محکمہ تعلیم بلوچستان میں مختلف اہم عہدوں پر تعینات رہنے کے بعد ۱۹۸۴ء میں ریٹائر ہوئے، تاہم ان کا مستقل قیام کوئٹہ ہی میں رہا۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل کوئٹہ کے خراب حالات اور بدامنی کے باعث وہ اپنے ایک بیٹے کے پاس کراچی چلے گئے، جہاں ۲۰۱۳ء میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین ہوئی۔ بلوچستان کے مختلف کالجوں میں تدریس اور انتظامی عہدوں پر مامور رہنے کے ساتھ ساتھ انور رومان تصنیفی سرگرمیوں میں بھی مصروف رہے۔ ان کی پچاس کے قریب کتب اور متعدد مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخ کا استاد ہونے کے باعث اس مضمون سے ان کا شغف بنیادی نوعیت کا رہا۔ ان کے اکثر مقالات کا موضوع تاریخ ہے، چاہے وہ کسی علاقے کی تاریخ ہو یا پھر اہم تاریخی شخصیات کا بیان۔ ان کی تحریروں میں بلوچستان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ، یہاں کا ادب، ثقافت، اور سماجی موضوعات نمایاں ہیں۔ وہ ایک اہم مترجم بھی ہیں، انھوں نے بلوچستان کی تاریخ سے متعلق کئی اہم انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ انور رومان کو ادبی اصناف میں افسانے اور ڈرامے سے خصوصی لگاؤ تھا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ وہ بلوچستان میں اردو کے پہلے باقاعدہ افسانہ نگار بھی ہیں[۶]۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈرامے بھی لکھتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی ہیں، جب کہ ان کی تاثراتی، تنقیدی نوعیت کی تحریریں بھی موجود ہیں۔

یہ مضمون ان کی نثری نظموں سے متعلق ہے، لہٰذا یہاں صرف ان کی نثری نظموں پر تفصیل سے بات کرنا مقصود ہے۔ ان کی مطبوعہ نظموں کی تعداد سو کے قریب ہے،۔ اس قدر نظمیں، اور ان میں سے بعض اچھی اور بعض بہت اچھی نظمیں انور رومان کو بالخصوص اپنے زمانۂ تخلیق کے لحاظ سے ایک اچھا شاعر ثابت کرتی ہیں۔ چناں چہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک ہمہ جہت ادیب تھے۔ بلوچستان میں اردو تحقیق کے بنیاد گزار اور کئی کتب کے مصنف و مؤلف انعام الحق کوثر ان کے برادر خورد تھے[۷]۔ دونوں بھائی ساری عمر تحقیق و تصنیف میں مصروف رہے۔ انور رومان کی چند اہم تصنیفات میں بروہی کی لوک کہانیاں (۱۹۶۵ء)، خانہ بہ دوش (۲۰۰۵ء)، قمقمے (۱۹۷۷ء)، انواریے (۲۰۰۰ء)، رومانیے (۲۰۰۱ء)، اقبال اور مغربی استعمار (۱۹۸۹ء)، کوئٹہ قلات کے براہوی (۱۹۶۰ء) اور بلوچستان میں اردو ذریعہ تعلیم (۱۹۸۷) جب کہ تاریخ کے موضوع پر کئی انگریزی کتب کے اردو تراجم شامل ہیں۔ انور رومان نے بلوچستان میں کئی نسلوں کی تعلیم و تربیت میں اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا۔

مغرب کی شعری روایت میں فرانسیسی شاعر شارل بودلیئر (Charles Baudelaire۔۱۸۲۱ء-۱۸۶۱ء) کو نثری نظم کا پہلا شاعر اور ان کی کتاب پیرس کا کرب (۱۸۶۹ء) کو نثری نظم کا پہلا مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ اردو میں سجاد ظہیر (۱۸۹۹ء-۱۹۷۳ء) اور ان کے مجموعے پگھلا نیلم (۱۹۶۴ء) کو یہی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نثر لطیف کے طور پر اردو میں نثری شاعری کی ابتدائی صورت بیسویں صدی کے اوائل میں ملتی ہے۔ اردو نثری نظم کی تنقید اور تبصروں میں سجاد ظہیر کے ساتھ ساتھ مبارک احمد (۱۹۲۵ء-۲۰۰۴ء) اور احمد ہمیش (۱۹۴۰ء-۲۰۱۳ء) کو نثری نظم کے اوّلین شعرا کہا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ انور رومان کو نثری نظم کے ان دو چار اوّلین شعرا میں شمار کیا جانا چاہیے، کہ ان کی نظموں کی تعداد اور معیار کم نہیں اور ان کی نثری نظمیں اپنے موضوعات اور خصائص میں منفرد ہیں۔ وہ بلوچستان میں نثری نظم کے پہلے اور اردو نثری نظم میں اوّلین شعرا میں شامل کیے جاتے ہیں۔

انور رومان کی نثری نظمیں ان کی دو مطبوعہ کتابوں قمقمے اور انوار یے میں شامل ہیں، چوں کہ ان کتابوں میں نثری نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ تمثیلی کہانیاں اور افسانے بھی شامل ہیں، شاید اسی وجہ سے ان تحریروں کی اصناف کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ جس زمانے میں یہ نظمیں لکھی گئی تھیں، یعنی گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں اس وقت نثری نظم ایک متنازع صنف تھی۔ اردو کے کئی ناقدین کو اسے ایک شعری صنف قرار دینے میں تامل تھا۔ شاعری میں قافیے اور ردیف کے عادی روایتی ذہن کے لیے ان خوبیوں کے بغیر کسی فن پارے کی تفہیم اور قبولیت مشکل تھی۔ روائتی ذہن یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا اور شاید اب بھی ہے کہ شاعری کے لیے ردیف قافیے کا ہونا لازمی نہیں اور صرف اوزان و بحور کی پابندی سے کوئی کلام شاعری کے اعلیٰ منصب پر فائز نہیں ہو جاتا، کہ در حقیقت شاعری چیزے دگر است۔ ایسی ادبی فضا میں نقاد کے ساتھ ساتھ خود تخلیق کار بھی تذبذب کا شکار تھا۔ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ قمقمے اہم ادبی مراکز (لاہور، کراچی) سے دور بلوچستان کے دار لحکومت کوئٹہ سے شائع ہوئی تھی۔ قمقمے میں شاعر کی جانب سے اپنی تخلیقات کے بارے میں کوئی دعویٰ یا وضاحت نہیں ملتی مگر کتاب کے پس سرورق پر ماہر لسانیات اور استاد خلیل صدیقی (۱۹۲۰ء-۱۹۸۷ء) کی مختصر رائے ان تحریروں کی صنف کے عدم تعین کے باوجود ان کے جمالیاتی حسن کی گواہی دیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”قمقمے کے فن پارے روایتی اور مروجہ اصناف ادب کے لوازمات اور تکنیک کا التزام کر کے نہیں لکھے گئے اور ان کی صنفی حیثیت کا حتمی اور قطعی تعین مناسب بھی نہیں، تاہم ان کے بھرپور تاثر اور فن کار کے فنی خلوص کی کرشمہ سازیاں دامن دل کو کھینچتی ہیں“[۸]۔

خلیل صدیقی کی محولہ بالا مختصر تحریر میں اس زمانے میں نثری نظم کے بارے میں پائی جانے والی عمومی ادبی فضا اور مخاصمانہ رویوں کا احساس بہ خوبی جھلکتا ہے، کہ وہ ان کی صنف کے تعین کو مناسب نہیں سمجھتے۔ وہ ان تحریروں کے ”بھرپور تاثر“ اور ”فنی خلوص کی کرشمہ سازیوں“ کے تو قائل ہیں مگر اس کے باوجود کھل کر ان کی صنفی حیثیت کے حتمی تعین سے قاصر

ہیں۔ کیوں کہ ان میں ''مروجہ اصناف ادب کے لوازمات'' کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ مروجہ لوازمات سے ان کی مراد بحور و اوزان اور ردیف، قافیے کی پابندی ہے، جنھیں نثری نظم کے شاعروں نے یک سر اٹھا دیا تھا۔ اور یوں ایک طرح سے اپنے لیے بہ ظاہر آسانیاں پیدا کر لی تھیں۔ اس پہلی کتاب میں خود شاعر کی طرف سے اپنی نظموں کے حوالے سے کوئی رائے نہیں ملتی۔ شاید وہ اپنی تحریروں کی ادبی سطح سے واقف اور اسی پر قانع ہے کہ اس نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اسے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔ آگے قاری کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان تحریروں کو کیا سمجھتا ہے۔ تاہم اپنی دوسری کتاب انواریے (۲۰۰۰ء) کے پیش لفظ میں، جو پہلی کتاب کے کئی سال بعد شائع ہوئی، مگر اس میں شامل نظمیں گزشتہ صدی کی ستر کی دہائی میں ہی لکھی گئی تھیں، وہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں تخلیق کار کی واضح تنقیدی رائے اور موقف بھی سامنے آتا ہے:

> ۱۹۷۷ء میں میری ایسی ہی کتاب قمقمے چھپی تو لوگوں نے کہا ''یہ کیا ہے؟ کہیں لمبی لمبی عبارتیں اور کہیں ایک سطر میں ایک دو لفظ؟'' میں نے کہا ''مجھے اظہار ذات مطلوب تھا اور وہ میں نے کر دیا۔ آپ لوگ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ہر پارے میں، مَیں نے جو کچھ کہا ہے، وہ کیا ہے؟ کیا اس میں کوئی تاثر، کوئی پیغام، کوئی امید، کوئی صداقت، کوئی حسن ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اسے پھاڑ کر پھینک دیں یا میرے منہ پر دے ماریں کہ لے جاؤ اس خرافات کو! لیکن اگر اسے پڑھنے سے آپ کے دل میں کوئی تار ہلی ہو اور ذہن میں کوئی گدگداہٹ اور کسمساہٹ محسوس ہوئی ہو تو بابا! اس تحریر کی صورت پر ہی اڑ کر نہ بیٹھ جاؤ، جہاں اتنے دوسرے پیرائے اور اسلوب برداشت کرتے ہو، وہاں اسے بھی کر لو[۹]۔

درج بالا اقتباس میں انور رومان کے نثری نظم کے بارے میں پائے جانے والے ''لوگوں'' کے عام خیالات کو رد کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کتاب پر سوالات اٹھائے گئے تھے۔ انور رومان نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی تحریروں پر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ یہ کیسی تحریریں ہیں۔ کہیں پورا جملہ یا آدھا جملہ ہے اور کہیں پوری سطر میں محض ایک لفظ۔ یعنی قارئین نے نثری نظم کی ساخت، ظاہری صورت اور پیش کش پر سوال اٹھائے تھے۔ غزل اور پابند نظم کے برعکس نثری نظم کے مصرعے یکساں سائز کے نہیں ہوتے، اس میں کہیں کہیں شاعر صرف ایک لفظ، بعض اوقات ایک لفظ بھی الگ الگ حروف کی شکل میں لکھ دیتا ہے۔ یہ سب آج بھی ایک روایتی ذہن کے لیے ناقابل قبول ہو سکتا ہے۔ انور رومان نے لوگوں کے ان خیالات کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ خود شاعری کی ماہیت کے بارے میں بھی مختصراً اپنی رائے کا اظہار کر دیا کہ یہ ایک تاثر، امید اور پیغام کی حامل ہوتی ہے اور اس میں ایک صداقت اور ایک حسن پایا جاتا ہے۔ بلاشبہ انور رومان کی کئی نظمیں ان خوبیوں کی حامل ہیں۔ مثلاً قمقمے میں شامل انور رومان کی پہلی نظم ''شکریہ'' (۱۹۶۳ء) ملاحظہ ہو۔

شکریہ میرے ان دوستوں کا

جنھوں نے
مجھے ہنستا ہوا پھول سمجھا
اور
وہ
مجھ میں
دہکتے ہوئے انگارے
اور
ابھرتے ہوئے سورج
نہ دیکھ سکے [۱۰]

چند سطروں پر مشتمل یہ ایک مختصر مگر بھرپور تاثر کی حامل نظم ہے۔ اس میں پھول اور انگارے جیسے دو متضاد الفاظ کو استعارہ بنا کر انسان کی نفسی صورت حال کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ پھول، رنگ اور حسن کی علامت ہے تو انگارہ گرمی اور حرارت کی۔ آدمی کا وجود سرد و گرم کا آمیزہ ہے۔ اس کی دنیائے خیال بھی جمال و جلال کا مرکب ہے۔ زندگی بھوگتا آدمی ایک وقت پھول کی طرح ہلکا پھلکا، رنگ چھلکاتا محسوس ہوتا ہے تو دوسرے سمے قہر و غضب ڈھانے لگتا ہے۔ اسی دھوپ چھاؤں میں اس کی زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ آدمی ایک ایسا اسرار ہے جسے حتمی طور پر سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ یہی اس نظم کا بنیادی موضوع ہے۔ دوسری طرف یہ نظم انسانی رشتوں کے تال میل، اور فرد کی معاشرے اور معاشرے کی فرد سے روا رکھی جانے والی بے گانگی کے احساس کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ یہ بے گانگی اس جدید عہد کا خاصا ہے۔ آج کا انسان ایک ایسے دور میں زندہ ہے جب وہ اپنے نزدیک رہنے والے انسان سے جذباتی طور پر دور ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر انسان بلکہ کائنات کا ہر ذرہ اپنے اندر امکانات کی ایک وسیع اور بے کنار دنیا رکھتا ہے۔ انسانی ذہن کی کوئی آخری حد نہیں ہے، کون جانے کہ یہ "بلیک ہول" اپنے اندر کتنے جلتے ہوئے سورج چھپائے ہوئے ہے۔ آدمی اپنے باطن میں کتنے تلاطم چھپائے بہ ظاہر ایک سمندر کی طرح پر سکون رہتا ہے۔ گہرے تاثر سے لب ریز یہ نظم جہاں شاعر کی حساسیت کی دلیل ہے، وہاں لفظ و معنی کی یک جائی نے اسے ایک ایسا فن پارہ بنا دیا ہے جو نثری نظم کی ہر تعریف پر پورا اترتا ہے۔

ان کی کئی نظموں میں حب دنیا سے نفرت ظاہر کی گئی ہے اور دنیاوی مصائب کو حقیر اور عارضی بتایا گیا ہے۔ مذہبی عقیدے میں دنیا کو تار عنکبوت سے تشبیہ دے کر اس کی ناپائیداری اور حقارت کو مستحکم کیا گیا ہے۔ اردو شاعری میں ایسے خیالات

کے اظہار کی قدیم اور مضبوط روایت پائی جاتی ہے۔ انور رومان نہ صرف اس روایت سے آشنا ہیں بلکہ وہ اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں اپنی خلاقانہ آواز بھی شامل کر دیتے ہیں۔ دنیا کی فنا پذیری اور الم ناکی کا احساس ان کے شعری رجحانات میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ تاہم مذہب سے عملی دل چسپی رکھنے کے باوجود ان کے ہاں کٹھ ملائیت کا سراغ نہیں ملتا بلکہ اس سے نفور کا احساس ملتا ہے۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ حکیمانہ افکار کی تلاش میں وہ کسی ایک مذہب تک محدود نہیں رہتے۔ مثلاً انور رومان کی ایک نظم میں بدھا کے افکار سے بھی ذہنی قربت کا سراغ ملتا ہے[۱]۔ جوان کی ذہنی بالیدگی اور قلبی وسعت کی دلیل ہے اور اس بات کا ثبوت بھی کہ وہ مذہبی انتہا پسند ہیں نہ کسی طرح کی تنگ نظری کا شکار۔ اگر یہ رائے صحیح ہے کہ شاعری یا فن شخصیت کا اظہار ہوتا ہے، تو اس کا اطلاق انور رومان پر کیا جا سکتا ہے کہ ان کے درویشانہ مزاج کی عکاسی اور قناعت کا اظہار ان کی کئی نظموں میں ہوتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''اے مسبب الاسباب'' (۱۹۶۳ء) یوں ہے:

میری زندگی میں
بارہا ایسا ہوا
کہ میں نے چاند کی خواہش کی
اور
میرے دامن میں سنگ ریزے آ گئے!
میں نے فراز کو چھونے کا سوچا
اور میں
نشیب میں جا دھنسا!
اور جب سنگ ریزوں سے مجھے پیار ہو گیا
اور میں نے نشیب سے سمجھوتہ کر لیا
تو چاند ٹوٹ کر میری آغوش میں آ گیا
اور
فراز میری راہ کا غبار بن گیا![۲]

روایتی معاشرے میں زندگی کرتا فرد آلام و مصائب کو قدرت کی طرف سے ایک امتحان سمجھتا ہے یا اپنے کردہ، ناکردہ گناہوں کی سزا۔ محولہ بالا نظم میں اس تصور زیست کا عکس اور ہر حال میں قانع رہنے کا احساس بہ خوبی جھلکتا ہے۔ اسی طرح مذہبی

تعلیمات میں دنیا کو مکروہات میں شمار کیا جاتا ہے۔ انور رومان کی ایک نظم ''مکڑی کے جالے'' (۱۹۶۸ء) کا عنوان بھی اسی رائے کی عکاسی کرتا ہے، اور نظم کے متن میں بھی دنیا اور حوادث دنیا سے بے پروائی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ مذہبی تعلیمات میں دنیا اور اس کے متعلقات کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دے کر جہاں اس کی کم زوری عیاں کی جاتی ہے وہاں اس سے ایک بے اصل شے بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مقصد دراصل اس سے شعوری طور پر فاصلہ اختیار کرنے کی ترغیب دینا ہوتا ہے یا اس میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کے سامنے انسانی بے چارگی اور بے بسی کو تسلیم کرنا ہوتا ہے۔ انور رومان کی نظم اس رائج خیال یا تصور کو رد کرتے ہوئے دنیاوی مصائب اور مشکلات کے سامنے ڈٹ جانے کی ترغیب دیتی ہے اور یوں آدمی اپنے عزم اور حوصلے کی بنا پر اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے:

یہ امنڈتا ہوا سیلاب
یہ بپھرتا ہوا جھکڑ
یہ زناٹے کی گونج
یہ بھوت کے ہولناک سائے
یہ طنطنے اور شنشنے!!
---------ڈرو نہیں اے میرے دوست!
یہ تو کچھ بھی نہیں
یہ تو مکڑی کے جالے ہیں!
انھیں چھوؤ تو سہی!
یہ تو ہاتھ لگتے ہی بکھر جائیں گے [۱۳]

بلوچستان نہ صرف مختلف زبانیں یعنی براہوی، بلوچی، پشتو، فارسی، سرائیکی اور ہزارگی بولنے والوں کا مسکن ہے بلکہ یہاں کی ثقافت بھی ملک کے دیگر حصوں سے قدرے مختلف اور متنوع ہے۔ اس خطے میں ان تمام زبانوں کے ادب کی ایک قابل قدر روایت موجود ہے۔ انور رومان کی مادری زبان پنجابی تھی، مگر بلوچستان میں طویل عرصے کے قیام کی وجہ سے انھیں نہ صرف مقامی زبانوں سے واقفیت تھی بلکہ ان زبانوں کے ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ وہ اردو اور انگریزی میں ان زبانوں کے ادب پر باقاعدہ نقد بھی کرتے رہے۔ اس مقامی شعری روایت کے مطالعے کے اثرات ان کی مختلف نظموں میں در آتے ہیں۔ ان کی نظم ''ایک بلوچ کا جوہر'' (۱۹۶۳ء) جہاں اپنے عنوان میں بلوچستان کے ثقافتی اور ادبی اثرات کی عکاسی کرتا ہے۔ وہاں نظم کا متن بلوچ

دھرتی کی خوشبو اور بلوچ جنگ جویانہ طرز احساس میں گندھا ہوا ہے، جو ان کی بلوچ ثقافت اور دھرتی سے پختہ جڑت کا واضح اشارہ ہے۔ ان کی نظم کا یہ پہلو انھیں اپنے ہم عصر شعرا کے حلقے میں ایک منفرد مقام دیتا ہے۔ ان کے کسی دوسرے معاصر نے اپنی دھرتی کے ایسے متنوع رنگوں اور منفرد ذائقے کو اپنی شاعری میں پیش نہیں کیا۔ ان کی نظموں میں ایسے عنصر نے ان کی انفرادیت کو استحکام بخشا ہے۔ آج بلوچستان میں لکھی جانے والی نظم میں یہ مقامی رنگ اور آہنگ ایک رجحان کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے اس انداز کی نظمیں نہ لکھی ہوں۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انور رومان نے مقامی موضوعات سے لیس ایک ایسے نئے اسلوب کی بنیاد رکھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلوچستان کا خاص طرز احساس ٹھہرا، اور اسے مختلف لکھنے والوں کے ہاں پذیرائی ملی:

اگر سورج چمکنا چھوڑ سکتا ہے
اگر بادل گرجنا بھول سکتا ہے
اگر بجلی اندھی ہو سکتی ہے
اگر پرندے چہکنا
اور
پھول مہکنا بند کر سکتے ہیں
اگر ہرن رینگ سکتے ہیں
اگر ناگ ڈسنے سے باز رہ سکتے ہیں
۔۔۔۔۔تو میں بھی۔۔۔۔۔
اپنی جاں بازی ترک کر سکتا ہوں![۱۴]

اس نظم کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق سے انور رومان نے اردو شاعری کو ایک بالکل نئے آہنگ سے آشنا کیا ہے۔ یہ اردو زبان کے روایتی شیریں اور مترنم لہجے کے برعکس ایک قبائلی نوجوان کا وہ کھردرا اور مزاحمت سے بھرپور لہجہ ہے جو قدیم عربی شاعری میں تو ملتا ہے مگر اردو میں اب تک نایاب تھا۔ واضح رہے یہ نظم ۱۹۶۳ء میں لکھی گئی تھی۔

بلوچستان کا سیاسی مسئلہ آج ملک بھر کی سیاست و صحافت کا ایک اہم موضوع ہے۔ بلوچستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ آج سے پچاس یا سو سال قبل اس مسئلے کی یہ صورت نہ تھی، جو آج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں، یعنی آج سے سو سال پہلے یہ مسئلہ سلطنت برطانیہ کے تحت بلوچستان کے شہریوں کو بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی (ان میں سیاسی تنظیم کاری، اخبار بینی اور

آزادانہ سفر کی اجازتیں شامل تھیں، اس وقت یہاں ان تینوں سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی)، سرداری نظام کے خاتمے اور بلوچستان کو صوبائی درجہ دینے کے مطالبوں سے شروع ہوا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اور قیام پاکستان کے بعد زیادہ تر حکمران طبقے کی عاقبت نا اندیشیوں کے باعث اس مسئلے نے موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ انور رومان کے قیام کوئٹہ کے عرصے، اور ان کی نظموں کے زمانۂ تخلیق میں بلوچستان میں علاحدگی پسندانہ رجحانات نہ تھے یا ان میں ایسی شدت نہیں تھی۔ اس لیے اس حوالے سے ان کا قلم خاموش ہے، مگر اس مسئلے کے دیگر متعدد پہلو موجود تھے، جو آج بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ شناخت کے بحران کا ہے۔ ایک طرف بلوچ شناخت کا بحران ہے جو پاکستانی وفاق میں بہ حیثیت ایک اکائی اپنی شناخت چاہتا ہے۔ اپنی اسی شناخت کے سوال پر ہی اب شدت پسند گروہ پاکستانی ریاست سے آزادی کا طالب ہے۔ دوسری طرف پشتون اور ہزارہ کی نسلی یا قومیتی شناخت کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح وہاں ایک اور طبقہ بھی ہے اور وہ اردو، پنجابی، سرائیکی اور کشمیری زبانیں بولنے والوں پر مشتمل ہے۔ اس طبقے کے بیشتر لوگ بیسویں صدی کے اوائل یا قیام پاکستان کے فوراً بعد سے بلوچستان کے مستقل باسی ہیں۔ ان کا جینا مرنا بلوچستان میں ہے اور یہ سب اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی ایک مقامی زبان بولتے ہیں، ثقافتی لحاظ سے انھیں بلوچ پشتون کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ مگر جہاں بلوچ پشتون اپنی شناخت کے طالب ہیں وہاں ایسے مستقل باشندوں سے زبان اور نسل کی بنا پر ناروا تعصب برتا جاتا ہے۔ انھیں حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور ان کا شمار تیسرے درجے کے شہریوں میں ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی مقامی قبیلے مثلاً احمد زئی، بگٹی، رئیسانی، شیرانی، مری، مینگل، کاکڑ، مندوخیل، وغیرہ سے تعلق نہیں رکھتا تو اس کی کوئی عزت نہیں، وہ کسی شمار میں نہیں۔ مقامی لوگوں کے مقابل ایسے لوگوں کو تحقیر سے نان لوکل، سیٹلر اور باہر والا کہا جاتا ہے۔ مقامی فرد کو لوکل کے نام سے شہریت کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے، جب کہ غیر مقامی فرد کو ڈومی سائل دے کر ہی تفریق کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔ انور رومان نے اس حساس پہلو کو بڑی جرات، بے باکی اور خوبی سے اپنی ایک نظم "شناخت(۱)" (۱۹۷۱ء) کا موضوع بنایا ہے، جو ان کے نثری نظموں کے دوسرے مجموعے انواریے کی پہلی نظم ہے:

میں محبت خیل ہوں
قلب زئی ہوں
ضمیرانی ہوں
اور
اگر میں آپ کا بھائی نہیں
دوست نہیں

عزیز نہیں
سیال نہیں
برات نہیں
ایلم نہیں
تو پھر۔۔۔ میں
ایک تخیل کا اڑتا ہوا پرخچا ہوں
ایک تصور کا مٹتا ہوا نشان ہوں
انسانیت کا مزار ہوں![۱۵]

درج بالا نظم میں شاعر نے جہاں ایک اہم سماجی مسئلے کو عمدگی سے موضوع بنایا ہے وہاں زبان کے حوالے سے لسانی تشکیل نو بھی کی ہے۔ انور رومان نے اردو اور بلوچی لفظیات کی آمیزش سے نئی اور بامعنی تراکیب ''محبت خیل''، ''قلب زئی'' اور ''ضمیرانی'' وضع کی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بلوچی، براہوی الفاظ جیسے سیال (رشتہ دار)، برات (بھائی)، ایلم (بھائی) بھی برتے ہیں۔ وہ بلوچستان کی اردو شعری روایت میں اس ذولسانی ترکیب سازی اور مقامی لفظیات کے برتاوے کے حوالے سے بھی اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بعد بہت سے لکھنے والوں نے ایسی لسانی موشگافیاں کی ہیں، ان میں سے عطاشاد (۱۹۳۹ء-۱۹۹۷ء) اور ان کے شعری مجموعے سنگاب (۱۹۸۵ء) کی بجا طور پر زیادہ پذیرائی ہوئی۔ ان کا یہ کام اہم ہے اور اس کی اہمیت جاننے کے لیے بلوچستان کے تہذیبی طرز احساس کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس قبائلی معاشرے میں زندگی جیتے کسی بھی فرد کے لیے کسی بڑے اور نامور قبیلے کا فرد ہونا بہت اہم ہے۔ یہ اس کی ساری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کی ساری خوشیاں یا محرومیاں لاتا ہے۔ یا تو وہ ایک فخر سے مالا مال ہوتا ہے اور یا پھر شرم ساری میں مبتلا رہتا ہے۔ یعنی کسی اہم قبیلے میں پیدا ہو جانا یا نہ ہونا، جس میں فرد کا انتخاب شامل نہیں، اس کے اثرات اس کی ساری زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ انور رومان نے اپنی نظم میں اس بے جا قبائلی تفاخر اور کہنا چاہیے ایک ناروا انداز فکر اور نسلی تعصب کو لسانی اور فکری طور پر پلٹانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ یعنی وہ مندوخیل، سلمان خیل جیسے حقیقی مگر محدود قبیلے کی بجائے ایک خیالی مگر وسیع قبیلے "محبت خیل" کی صدا لگاتے ہیں، جس میں ہر فرد بلا تمیز رنگ و نسل و زبان شامل ہو سکتا ہے۔ اس طرح احمد زئی، محمد زئی، اور شیرانی، رئیسانی جیسے محدود نسلی قبیلے کی جگہ وہ قلب زئی اور ضمیرانی جیسے عالم گیر انسانی قبیلے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان کے ان فرضی قبیلوں میں تنگ نظری، اور قبائلی حسد کی بجائے انسانوں کے لیے وافر محبت اور کشادگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ آج کی دنیا عملی طور پر ایک عالمی گاؤں میں ڈھل چکی ہے۔ ہر فرد دوسرے فرد سے جڑا ہوا ہے۔ ایسی دنیا میں

لسانی اور نسلی عصبیت روا رکھنا ایک غیر پسندیدہ طرز فکر سمجھا جاتا ہے۔ یہ قابل فخر تو ہر گز نہیں، نہ اس کی کوئی اہمیت ہے۔ ہر فرد اپنے جوہر میں منفرد اور یکتا ہے اور اپنی ذاتی قابلیت، محنت اور تخلیقیت کے بل پر آگے بڑھ سکتا ہے۔ پر امن اور خوش و خرم زندگی بلا تفریق زبان و نسل ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ اگر کوئی معاشرہ کسی انسانی گروہ سے فاصلہ رکھتا ہے تو اسے ایک صحت مندہ معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ جب کہ بلوچستان میں ہر قبیلہ یا ذیلی قبیلہ، یہاں تک کہ ایک گاؤں کے لوگ بھی دوسرے گاؤں کے مقابل خود کو برتر اور بہتر قرار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ پرانے عرب قبیلوں کے مانند دہائیوں تک قبائلی رنجشوں کا شکار رہتے ہیں۔ انور رومان نے جہاں بر سر زمین مسلسل اجنبیت کے وار سہتے، اور توہین کا نشانہ بنتے اپنے طبقے کے اس اہم مسئلے کو نشان زد کیا، اور اس کی آواز بنے۔ وہاں انھوں نے اسی عنوان سے ایک دوسری نظم ''شناخت (۲)'' (۱۹۷۷ء) میں مقامی فرد کی جانب سے اس غیر مقامی طبقے کے لیے اپنائیت اور محبت بھی دکھائی ہے۔ ایسا طبقہ جو مستقل طور پر قیام پذیر غیر مقامی لوگوں کو اپنی طرح برابر کا شہری سمجھتا ہے اگرچہ ہے مگر بہت کم ہے اور اس کا دائرۂ اثر محدود تر ہے۔

وہی ٹوپی موتیوں والی
وہی شلوار بھاری بھر کم
وہی قمیص کاڑھی ہوئی
وہ بالکل مانوس تھا
اس میں اپنائیت تھی!
اور تو اور
وہ زبانیں بھی وہی بول رہا تھا
جو میری زبانیں ہیں![16]

مقامیت اور اس کی اہمیت، مابعد جدید ادب اور تنقید کے بنیادی سروکاروں میں سے ہے۔ معاصر اردو تنقید میں اس کے مباحث ایک تسلسل سے موضوع بنتے رہے ہیں۔ چناں چہ نوجوان اور نئے لکھاریوں کے ہاں اس کے اثرات ایک فیشن کے طور پر نظر آتے ہیں۔ انور رومان نے جس عرصے میں، یعنی گزشتہ صدی کی ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں، مقامیت کے عناصر کو اپنی نظموں میں پورے تخلیقی رچاؤ کے ساتھ برتا، اس وقت کے ادبی منظر نامے میں یہ ایک نئی بات تھی۔ ان کی جو دیگر نظمیں اس رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں، ان میں ''ایک بوڑھے براہوی کی وصیت'' (۱۹۶۳ء)، ''بلوچ'' (۱۹۶۸ء)، ''باغی'' (۱۹۷۶ء)، ''پتھروں کا انتظار'' (۱۹۷۷ء)، ''وطن'' (۱۹۷۷ء)، ''خالق و مخلوق'' (۱۹۷۷ء)، ''اشارۂ غیب'' (۱۹۷۷ء)، ''ضدین'' (۱۹۷۷ء) شامل ہیں۔ ان کی ایسی نظموں

میں بلوچستان کا مخصوص طرز احساس اور وہ مخصوص فضا اور لہجہ ابتدائی شکل میں ملتا ہے، جو آگے چل کر زیادہ بلیغ انداز میں عطا شاد اور دیگر شعرا کے ہاں صورت پذیر ہوا۔

جہاں تک انور رومان کے مجموعی شعری رجحانات کا تعلق ہے، ان کے ہاں دو رجحان نمایاں طور پر نظر آتے ہیں؛ ایک قومی یا پاکستانی ادب کا رجحان اور دوسرا ترقی پسند۔ جس زمانے یعنی گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں انور رومان نے نثری نظم کی جانب اپنی توجہ مبذول کی، اس وقت اس نئے ملک میں اسلامی اور پاکستانی ادب کی تحریک سرگرم تھی؛ ادبا و شعرا کا ایک وسیع حلقہ فکری اور عملی طور پر اس سے متاثر ہوا، اور اس نے اس نئے میلان کے تحت شعوری طور پر اپنی تخلیقات میں ایسے موضوعات کو پیش کرنے کی کاوش کی اور اس میں نام پیدا کیا۔ انور رومان کو اپنے مشاغل، حلقۂ احباب اور اسلامی عقائد پر راسخ اعتقاد اور ان کی پابندی کے باعث راست فکر ادیب اور استاد سمجھا جاتا ہے۔ ان کا اس نئی تحریک سے اثر لینا عین فطری تھا۔ ان کی شعری تخلیقات اور دیگر تحریروں کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف پاکستانی ادب کی تحریک سے متاثر ہوئے بلکہ یہ ان کی فکری ساخت اور شعری رجحانات میں ایک نمایاں پہلو رکھتا ہے۔ ان کی متعدد نظمیں اس رجحان کی نمائندہ ہیں۔ ان نظموں میں ''یمین و یسار''، ''وطن''، ''انتخاب راہ''، ''بشارت''، ''سجدہ گاہ''، ''خس کم جہاں پاک''، ''بھوت پریت''، ''غازیان گفتار''، ''ذمہ دار کون''، ''وطن اور انسان'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان نظموں کے نہ صرف عنوانات اس رجحان کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ان کے موضوعات میں وطن و ابنائے وطن، اس کے جملہ مسائل اور اس کے بہتر مستقبل کے بارے گہرے تفکرات پائے جاتے ہیں۔ ان نظموں میں کہیں کہیں اسلامی روایت سے استفادہ بھی نظر آتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ دائیں بازو کی جانب واضح جھکاؤ کے باوجود وہ کبھی مذہبی یا مذہبی سیاسی اشرافیہ کے قریب نہیں رہے۔ ان کی کئی نظموں میں اہل اقتدار پر طنز و تشنیع اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نہ صرف معاصر سیاسی منظر نامے پر کڑی نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کا قلبِ نامطمئن اس پر کڑھتا رہتا ہے، اور اس کا اظہار وہ اپنی نظموں میں کرتے ہیں۔ ان کی نصف کے قریب نظمیں ایسے سماجی اور سیاسی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہ امر دل چسپ ہے کہ انور رومان کبھی "نظریاتی" ترقی پسند نہیں رہے، تاہم ان کی کئی نظموں میں ترقی پسند افکار واضح طور پر نظر آتے ہیں، بلکہ یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ پاکستانی یا قومی ادب کے پہلو بہ پہلو ترقی پسندانہ افکار کی عکاسی ان کے شعری رجحانات کا دوسرا مضبوط ترین حوالہ ہے۔ اپنے زمانے کے بعض شعرا کے برعکس ماسکو سے فکری جڑت یا اس کا برملا اعلان تو ان کے ہاں بجا طور پر نہیں ملتا مگر ''انقلاب'' جیسا لفظ ان کے ہاں مختلف حالتوں اور معنوں میں ملتا ہے۔ کہیں اپنے اصل مطلب میں اور کہیں طنزاً۔ جب کہ ان کے ہاں مساوات پر مبنی ایک عالم گیر معاشرے کا تصور بھی پایا جاتا ہے یا کم از کم اس کی خواہش پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام کا معتد بہ حصہ ایسی نظموں پر مشتمل ہے، جس میں جاگیر دار یا مقتدر طبقے پر طنز اور قہر اور اس کے مقابل مظلوم طبقے کی حمایت ملتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے فکری یا عملی طور پر

منسلک نہ ہونے کے باوجود ترقی پسند عناصر ان کی شاعری میں در آئے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی انسان دوستی اور ابن آدم سے گہری ہم دردی ہے۔ ان کی ایسی نظموں میں کہیں کہیں بغاوت اور مزاحمت کا لہجہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ان کی اس نوع کی نمایاں نظموں میں "باغی"، "یہ کون ہے"، "مری"، "فرعون سے فرعون تک"، "دیا"، "خالق و مخلوق"، "میں اور تو"، "آلہ کار" اور "نغمہ و نعرہ" ہیں۔ ایک نظم "روح العصر" (۱۹۷۷ء) میں کہتے ہیں:

ہلاکت کی گاڑی کے بے ضمیر پہیو!
اگلے لمحے تم سب کو اس مردہ مجسمے پر ڈھیر ہونا ہو گا
اور اس کے فوراً بعد
قصر استبداد مسمار کر دیا جائے گا
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
اور جھونپڑیاں جگمگا اٹھیں گی
اور انسان آزاد ہو گا
اور ضمیر کی روشنی کا قائد
انسانی قافلے کو نئے سر سے ترتیب دے گا[۱۷]

ان کی نظم "آزادی کی سالگرہ" (۱۹۶۸ء) نہ صرف اپنے عنوان بلکہ متن سے فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء) کی نظم "صبح آزادی" سے متاثر محسوس ہوتی ہے کہ اس میں بھی آزادی وطن کے باوجود عام آدمی کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ آنے کی کیفیت بیان ہوئی ہے۔ تاہم جہاں فیض کی نظم اپنے موضوع، مترنم لہجے اور غنائیہ آہنگ کے سبب حرف و معنی کا خوب صورت مرقع ہے وہاں انور رومان کی نظم ایک سادہ نثری بیانیے پر مشتمل ہے۔ ان دونوں نظموں کا فنی حوالے سے تقابل مناسب نہیں، البتہ موضوع میں جو یکسانیت پائی جاتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فیض کی اس معروف نظم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ انور رومان کی نظموں کا ایک بڑا حصہ فطرت اور عناصر فطرت سے ہم کلامی، عکاسی، اور علامت نگاری پر مشتمل ہے۔ نباتات میں درخت، پھول، باغ، رکھ، گلاب، چاند، سورج، حیوانات میں بچھو، چیتے، سانپ، بھیڑیے، گدھے، ہرن، ناگ، اور جمادات میں برف، پتھر، پہاڑ، سنگ ریزے اور چاند، سورج، دریا، سمندر اور ندی، نالوں سمیت بے شمار دوسری فطری اشیا کا تذکرہ ان کی نظموں میں کہیں سادہ اور کہیں علامتوں کے پیرائے میں ملتا ہے۔ یہ فطرت سے ان کے لگاؤ اور دل چسپی کو ظاہر ہی نہیں کرتا بلکہ وہ انسان کے لیے ان سب فطری عناصر کی اہمیت جتاتے اور انسان کو ان فطری عناصر کی جانب راغب کرتے ہیں۔ اس حوالے سے "ہوا کا ایک جھونکا" (۱۹۶۳ء)

کو ان کی نمائندہ نظم کہا جا سکتا ہے:

راہی! کبھی تم نے دیکھا
کہ ہوا کے ایک ہی جھونکے سے
پھول لہلہاتے ہیں
درختوں کے پتے سرسراتے ہیں
پرندے چہکار کرتے ہیں
دریا میں لہریں اٹھتی ہیں
اور سلگتی ہوئی آگ جلنے لگتی ہے!
اور اس کے کاندھوں پر سوار
کہیں کی انسانی آوازیں
کہیں کے انسانی کانوں سے جا ٹکراتی ہیں![۱۸]

فطرت اور مظاہر فطرت سے گہری دل چسپی کی حامل نظموں میں ان کی شخصیت کا جذباتی اور رومانی پہلو بھی نظر آتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ انور رومان ایک حساس اور گداز دل رکھتے ہیں۔ وہ سیاست اور سماج کے تلخ موضوعات پر لکھتے ہیں مگر ان کا قلم انھی موضوعات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ انھیں فطرت کی نوع بہ نوع رعنائیوں سے بھی دل چسپی ہے۔ حسن بھی انھیں متاثر کرتا ہے بلکہ ایک رومان پرور شخص کی طرح وہ ہر طرف امڈتے حسن کو دیکھتے ہیں، اس سے سرشار ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ گیتوں اور موسیقی سے بھی برابر دل چسپی رکھتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی سچا تخلیق کار خوب صورتی، حسن، گیتوں اور نغموں سے سروکار نہ رکھے۔ ان کی بعض نظمیں اس رومان انگیز میلان کی عکاسی کرتی ہیں، مثلاً ''آپ بیتی''، ''تلاش''، اور ''خودکشی'' وغیرہ۔ ان کی ایک نظم ''شہید ذوق'' (۱۹۷۷ء) کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

گویا یہ دنیا
گیتوں کی دنیا ہو
لیکن میں نے اپنی پسند کا ایک ہی گیت چنا ہے
اور میں وہی
بار بار سنتا ہوں، گنگناتا ہوں

اور گاہے گاہے
کھل کر گاتا بھی ہوں![19]

ایک حساس فن کار زندگی کے ازلی اور ابدی سوالوں سے کیسے بچ سکتا ہے۔ زندگی کی ابتدا کب ہوئی؟ انسان کہاں سے آیا اور کہاں چلا جاتا ہے؟ زندگی کا یہ کھیل کب تک جاری رہے گا؟ اور اس کی انتہا کیا ہے؟ ایسے اور اس طرح کے دیگر سوالات صدیوں سے انسانی سوچ بچار کا اہم حصہ رہے ہیں۔ فلسفیوں نے ایسے موضوعات پر باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں تو ہر زبان کے تخلیق کاروں نے انھیں اپنی شاعری اور کہانیوں میں مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ آدمی کی زندگی جیسی بھی ہو کوئی انسان بھی مرنا نہیں چاہتا کہ مرنے کے معنی اس خوب صورت دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے جانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لکھنا یعنی ادب تخلیق کرنا موت کے خلاف آدمی کی مزاحمت ہے۔ ہر لکھنے والا کچھ ایسا لکھنا چاہتا ہے جو زندگی میں اس کی شناخت بنے اور بعد از مرگ بھی اس کے نام کو زندہ رکھے۔ انور رومان کی نظموں میں جہاں تہاں ایسے مصرعے بھی پائے جاتے ہیں جن میں وجودی افکار کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ بعض نظموں کے عنوانات اور ان کے متن کا بیشتر حصہ اس میلان کی عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً ان کی ایک نظم "شکنجۂ تخلیق" (۱۹۷۷ء) ہے، نہ صرف اس نظم کے عنوان سے ایک تخلیق کار کی بے بسی کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ نظم کے کئی مسلسل مصرعوں سے وجودی کرب نمایاں ہوتا ہے۔ اسے اپنی زندگی ایک مقتل کی صورت لگتی ہے، جہاں ہر دن اس کی آرزوئیں اور تمنائیں قتل ہوتی نظر آتی ہیں۔ آخر ایک ایسی بے معنی زندگی کا کیا مصرف ہے:

میں مقتل میں کھڑا ہوں
اپنی آرزوؤں
تمناؤں
اور حسرتوں کے مرقد پر
لوحِ مزار کی طرح گڑا ہوا!
بے انتہا اداسی
لامتناہی خاموشی
غیر مختتم سکوت![20]

جہاں تک انور رومان کی نثری نظموں کی ساخت کا تعلق ہے، انھوں نے مختصر نظموں کے ساتھ ساتھ قدرے طویل یعنی دو تین صفحات پر مشتمل نظمیں بھی لکھی ہیں، مگر ان کی مختصر نظمیں بناوٹ میں زیادہ تیکھی، اسلوب میں پختہ اور اسی لیے گہرے تاثر

کی حامل ہیں۔ وہ اپنی نثری نظموں میں بھی کہیں کہیں قافیے کا التزام روا رکھتے ہیں۔ ان کی بیش تر نظمیں سطر در سطر چلتی ہیں، البتہ ایک آدھ نظم اقتباس کی صورت میں بھی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں جا بہ جا مقامی لفظیات بھی استعمال کرتے ہیں جب کہ ہندی الفاظ بھی ان کے ہاں متواتر اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ مختلف زبانوں کی لفظیات کے استعمال سے ان کی ان زبانوں سے گہری دل چسپی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے زیادہ تر موضوعات اپنے آس پاس کی زندگی سے متعلق ہیں، سو ان کے اظہار کے لیے ایسی لفظیات کا استعمال مناسب ہوتا ہے۔ وہ کہیں کہیں زندگی کے بنیادی سوالوں کو بھی نشان زد کرتے ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی بعض طویل اور سماجی و سیاسی موضوعات پر لکھی گئی نظمیں سپاٹ اور سادہ نثر کے قریب پہنچ کر اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات سے بہ طور ایک فن کار کبھی مخلص نہیں رہے۔ ان کے اپنی شعری تخلیقات کے ساتھ روا رکھے گئے رویے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے اندر موجود شاعر کو پنپنے کا خاطر خواہ موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نظموں کی قرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان نظموں پر نہ صرف یہ کہ مطلوبہ وقت صرف نہیں کیا گیا، ان کی کانٹ چھانٹ یا ان پر نظر ثانی نہیں کی گئی، بلکہ بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ اس لیے ان کی کئی نظمیں کم زور نظر آتی ہیں یا ان میں کم زور مصرعے پائے جاتے ہیں۔ بہ ہر حال تمام تر نقائص کے باوجود وہ نثری نظم کے اوّلین دور کے اہم شاعر ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

معاصر نثری نظم اپنے فکر و فن یعنی متنوع شعری رجحانات، ہئیتی تجربے اور موضوعات کے حوالے سے آج جس بلندی اور ارتفاع کو چھو رہی ہے۔ وہ اس صنف شعر کے عروج کی ناقابل تردید مثال ہے۔ تاہم فکر و فن کی اس اعلیٰ سطح پر انور رومان کی نظموں کا مطالعہ و موازنہ ان کے فن سے انصاف نہیں ہو گا۔ وہ اس صنف کے ابتدائی زمانے کے شاعر ہیں اور نثری نظم کا اوّلین زمانہ بھی دیگر اصنافِ ادب کی مانند بیشتر کم تر درجے کے تخلیق کاروں کا ہے، چاہے وہ سجاد ظہیر ہوں یا ان کے دوسرے ہم عصر۔ حقیقت یہ ہے کہ اوّل الذکر کا نام تو اب اس صنف میں محض تاریخی حوالے سے جانا جاتا ہے، ورنہ ان کی شاعری میں اتنی جان اور سکت نہیں کہ وہ نثری نظم کے قارئین کی یاداشت کا مستقل حصہ بن سکے۔ انور رومان کی نثری نظموں کی ماہیت اور ان کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے فن کا اجمالی تقابلی جائزہ نثری نظم کے ان کے انھی ہم عصر شعرا سے کیا جائے۔ ایسی پرکھ سے ہی ان کے فن کی حقیقی تفہیم ہو سکتی ہے۔ سجاد ظہیر کے ایک مختصر ناولٹ لندن میں ایک رات (۱۹۳۸ء) سے اردو ادب کا عام قاری بھی واقف ہے، ادبی حلقوں میں وہی ان کا بنیادی تعارف ہے۔ ان کے نثری نظم کے اوّلین مجموعے پگھلا نیلم میں ۳۵ کے قریب نظمیں شامل ہیں۔ وہ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے بانی ارکان میں سے تھے۔ ان کا اپنے نظریے اور تحریک سے وابستگی کا واشگاف اظہار ان کی نثری نظموں میں بھی ملتا ہے۔ ان کی ایک نظم کا عنوان "ماسکو میں تین" ہے۔ اس نظم میں اسی خواب کی عکاسی ملتی ہے جو اس تحریک سے وابستہ لوگوں کا آدرش تھا۔ سجاد ظہیر کے موضوعات میں ایک نئی دنیا کی تعمیر و تمنا، شہری آدمی کا

احساس تنہائی اور محبت انگیز معاملات شامل ہیں۔ ان کی نظموں میں محبت کے بارے میں جدید شہری آدمی کا کھلا ڈلا رویہ ملتا ہے، جو اپنے محبوب سے براہ راست اور بے تکلفانہ طور پر مخاطب ہوتا ہے۔ اس نوع کی نظموں میں ''ہونٹوں سے کم''، ''آج رات''، ''دریا''، ''تمھاری آنکھیں''، ''تمھارے بنا'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان نظموں کے متون بلکہ عنوانات سے بھی سجاد ظہیر کے ان محبت انگیز جذبات اور ایک الگ تخلیقی شخصیت کا سراغ ملتا ہے جو ان کی ترقی پسندی کے شور میں گم ہو کر رہ گئی۔ محبت کے پہلو بہ پہلو دنیا کو بدلنے کا عالم گیر خواب ان کی نظموں کا دوسرا اہم موضوع ہے، جہاں ان کا فکری کعبہ ماسکو ٹھہرتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو اس آزادی اور مستقبل کا خواب دکھاتے ہیں جو گزشتہ صدی میں ماسکو میں تعبیر ہوا اور آخر کار ٹوٹ گیا۔ ان میں وہ برملا طور پر لینن، کریملن، اور مزدوروں کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے سیاسی موقف میں وہ چین اور بھارت سمیت سارے ایشیا کی بات کرتے ہیں۔ سجاد ظہیر کی بعض نظمیں اچھی اور تیکھی ہیں، جب کہ بعض کو نعرہ بازی کا بوجھ سادہ اور سپاٹ بنا دیتا ہے۔ لسانی طور پر دیکھا جائے تو ان کی نظموں کے اکثر مصرعے بناوٹ میں سادہ ہیں مگر ان میں ہندی اساطیر و لفظیات کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ دیکھا جائے تو ترقی پسندی کے برملا اعلان اور ماسکو وغیرہ کے ذکر سے ہٹ کر مجبور و مقہور طبقے کی بات انور رومان کے ہاں بھی ملتی ہے۔ گویا انور رومان کسی نظریے کی بجائے اعلیٰ انسانی اقدار کے باعث انھی موضوعات پر اپنے انداز کی نظمیں لکھتے ہیں۔ نہ صرف ان کی نظموں کی تعداد سجاد ظہیر کی نظموں سے کافی زیادہ ہے بلکہ ان کی فکری و فنی جہات بھی ان کے مقابل وسیع اور پائیدار ہیں۔ ایسی انفرادیت اور وسعت سجاد ظہیر کے ہاں نہیں ملتی۔

اسی دور میں نثری نظم کے دوسرے اہم شاعر مبارک احمد ہیں۔ سجاد ظہیر کے برعکس مبارک احمد کل وقتی شاعر ہیں۔ ان کے کلیات میں نثری نظموں کی خاطر خواہ تعداد کے ساتھ غزلیں اور آزاد و پابند نظمیں بھی شامل ہیں۔ مبارک احمد کی نظموں میں سیاسی و سماجی موضوعات کی کثرت ان کے اس بنیادی رجحان کی عکاس ہیں۔ تاہم ان میں محبت آمیز جذبات بھی ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ادب و فن سے متعلق ہم عصر کرداروں کے نام اور اُن سے بے تکلف مکالمہ بھی بہ کثرت ملتا ہے۔ اسی طرح پاکستانی شہروں، علاقوں کے نام اور قومی حوالے سے پاکستانیت کا عنصر ان کی نظموں میں واضح نظر آتا ہے۔ ان کی نظم ''میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں'' (۱۹۶۳ء) سادہ بیانیے کی نظموں کے مقابل شاید پہلی مکمل علامتی نثری نظم ہے۔ اس میں ان کا فن اپنے عروج کو چھوتا نظر آتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ شاید یہی وہ پہلی نثری نظم ہے جس نے اس صنف میں وسیع امکانات کی جانب نئے شاعروں کو متوجہ کیا:

اور پھر عورتوں نے اپنے دائیں بازو کی چوڑیاں توڑیں
اور بائیں بازو کی چوڑیاں مردوں کو تحفے کے طور پر بھی بھیج

دیں
کہ وہ غاروں سے باہر نکل آئیں
پس غاروں سے شعلے نکلے
اندھیرے کے ماتھے پر روشنی کی تحریر بنے
اور میں نے دیکھا کہ دن پھرنے کو ہیں[۲۱]

محولہ بالا نظم کے عنوان ''میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں'' کو مد نظر رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک حساس شاعر یا راوی اپنے شعور کی آنکھ کھلی رکھنے کی بات کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور یہ اس کا نسلوں کا تجربہ ہے کہ زمین پر عمل خیر کرنے والے کو نتیجے میں برائی ملتی ہے، اور جو حقیقتاً برا ہوتا ہے اسے معاشرے میں عزت اور پذیرائی ملتی ہے۔ دنیا کے نظم و نسق میں اس کی اجارہ داری قائم ہوتی ہے۔ ایسے میں نظم کے راوی کو اپنی بے بسی کے تئیں اس کھیل میں آسمان سازش کرتا نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ نظم جدید علامتی نظم کا بیانیہ لیے ہوئے ہے مگر اس نظم کے آغاز میں ''آسمان'' کا استعارہ کلاسیکی شعریات کے مطابق برتا گیا ہے۔ جہاں زمین پر برپا ہر ظلم آسمان سے منسوب ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح عورتوں کا مردوں کو چوڑیاں بھیجنا دیہی طرز زندگی میں شرم اور غیرت کا احساس دلانے کے معنی میں مروج ہے۔ عورتیں مردوں کو جن غاروں سے نکالنا چاہتی ہیں، وہ سب سے زیادہ قابل توجہ اور اس نظم کو اہم اور جدید بناتی ہے۔ نظم کے قرینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان غاروں سے مراد عام غار نہیں، بلکہ تنگ نظری، تعصب، جہالت اور صنفی امتیاز کے وہ تاریک غار ہیں، جن میں اس معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہر آدمی (مرد و عورت) قید ہے۔ ان غاروں کے خاتمے سے ہی آدمی کے دن پھرنے کی امید کی جا سکتی ہے۔ اور صدیوں سے رائج ان رسمیات کے خاتمے میں مرد ہی کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہی اس نظم کا مرکزی خیال ہے۔ مبارک احمد کا شعری کینوس بہت وسیع اور متنوع رنگوں سے مالا مال ہے۔ اس میں پاکستانی اور عالمی سیاست پر اظہار خیال ملتا ہے اور قسم قسم کے سماجی مسائل بھی موضوع بنتے ہیں۔ حیات و کائنات کے ابدی مسائل کے ساتھ ساتھ مرد و عورت کے جذباتی معاملات بھی ایہاں اپنی چھب دکھاتے ہیں۔ جب کہ خدا کے بارے میں تشکیک کا رویہ ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں حاضر و موجود سے بے زاری اور دنیا کو بہتر کرنے کی آرزو ترقی پسند نقطہ نظر سے ملتی ہے۔ وہ ذہن میں در آنے والے ہر خیال کو نظم میں ڈھال دیتے ہیں۔ شاید یہ سہولت کاری نثری نظم کی فطرت میں ہے۔ تاہم ایسی اکثر نظمیں شعری تجربے کی بجائے محض عامیانہ خیالات کی تکرار بن کر رہ جاتی ہیں۔ چند ایس نظموں میں ''ٹوٹتی سطریں''، ''ایک نوحہ'' اور ''پاکستان ہوٹل'' شامل ہیں۔

لسانی حوالے سے مبارک احمد کا اختصاص یہ ہے کہ وہ ہر طرح کا لفظ اپنی نظموں میں کھپا دیتے ہیں چاہے وہ پلیٹ چمچہ اور

مکھن جیسے الفاظ ہی کیوں نہ ہوں، یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے شعوری طور پر عوامی زبان میں شاعری کی ہے۔ پھر جہاں وہ طویل نظمیں لکھتے ہیں وہاں تین چار مصرعوں پر مشتمل کئی مختصر نظمیں بھی ان کے ہاں ملتی ہیں۔ انور رومان نے اس قدر مختصر نظمیں نہیں لکھیں۔ مبارک احمد کے مقابلے میں ان کی نظموں کی تعداد بھی کم ہے۔ انور رومان ہر خیال کو نظم کرتے ہیں نہ ہی بہت عمومی الفاظ یا عوامی زبان ان کے ہاں ملتی ہے۔ ان کی نظم موضوع کے ساتھ ساتھ زبان کے حوالے سے بھی اپنی ایک سطح برقرار رکھتی ہے۔ پھر انور ورمان سیاسی، سماجی، یا ادبی طور پر شخصی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے ان کے ہاں کسی ایک معاصر کا نام نہیں ملتا جب کہ مبارک احمد کے ہاں اس کے برعکس معاصر شخصیات کے نام بہ کثرت ملتے ہیں اور وہ اپنی نظموں میں ان سے گویا مکالمہ کرنے لگتے ہیں۔ انور رومان کے ہاں اگرچہ سیاسی حالات وواقعات پر عدم اطمینان ملتا ہے، تاہم ایک تو اس کی شرح قدرے کم ہے دوسرا مبارک احمد اس معاملے پر واشگاف انداز میں بولتے ہیں۔ وہ نہ صرف مارشل لا اور فوجی ڈکٹیٹروں کی کھل کر مذمت کرتے ہیں، بلکہ آئین، جمہوریت، اور پیپلز پارٹی کی حمایت میں رطب اللسان ہوتے ہیں۔ ایسے موضوعات پر لکھتے ہوئے وہ یہ بات نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ان کی سیاسی نعرہ بازی نظم بن پائی ہے کہ نہیں۔ حیرت انگیز طور پر ان کے ہاں حب الوطنی اور پاکستانیت کا عنصر بھی بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ محبت اور عورت سے محبت انور رومان کے ہاں بہت کم، دھیمی لے میں اور ملفوف انداز میں ملتی ہے۔ اس کے برعکس مبارک احمد کے ہاں محبت پر مبنی جذبات واحساسات کا بیان پوری شد و مد سے ہوتا ہے۔ وہ اس معاملے میں کسی تکلف یا رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں ہیں۔ درحقیقت کسی بھی دو یا دو سے زائد شعرا کے تقابلی مطالعہ میں انصاف سے کام لینا ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر شاعر کے ہاں بہت کچھ یکساں ہونے کے ساتھ بہت کچھ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر ایک ہی زمانے کے مختلف شاعروں کے ہاں اگر شعری رجحانات میں یکسانیت موجود ہو، تو بھی اسلوب بہرحال ہر شاعر کا اپنا ہوتا ہے۔ یہی اسلوب کسی شاعر کی اہمیت طے کرتا ہے۔ انور رومان نے مقامی ثقافتی و لسانی عناصر کی شمولیت اور بلوچستان کے مخصوص طرز احساس سے اپنی نظموں کی بنت اور اسلوب میں ایسی انفرادیت پیدا کی ہے، جو اس ابتدائی عہد کے دوسرے شعرا میں نہیں ملتی۔ اس لیے ان کا فن اپنے معاصر شعرا سے الگ اور ممتاز نظر آتا ہے، اور اسی میں ان کے تخلیقی سرمائے کی اہمیت ہے۔

انور رومان کے ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی ہے، اور جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی اور پشتو میں بھی نثری نظمیں لکھی ہیں۔ اس طرح وہ اردو نثری نظم کی روایت میں ایک ذوالسانی شاعر کے طور پر اپنی منفرد شناخت کو مستحکم کرتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی سے بھی دو نظمیں اردو میں ترجمہ کی ہیں اور اپنی ایک اردو نظم کو بھی انگریزی میں ڈھالا ہے۔ اردو نظموں کے برعکس انور رومان کی پنجابی نظموں میں پیار و محبت کے موضوعات حاوی رجحان رکھتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''کمی'' (۱۹۷۶ء) یوں ہے:

تیرے کناں وچ سوہنے بندے
تیرے نک وچ سندرا کوکا
تیرے ہتھاں تے مہندی
تیری اکھیاں گلاں کردیاں
تیرے بول بین دا جادو
تو حسن دا سورج ایں[۲۲]

ترجمہ

تیرے کان میں سندر بُندا
تیری ناک میں سندر کوکا
تیرے ہاتھوں میں مہندی
تیری آنکھیں باتیں کرتی
تیرے بول ہیں بین کا جادو
تو حسن کا سورج ہے

اسی طرح ان کی واحد پشتو نظم "پیغام" (۱۹۷۴ء) ہے۔ قیاس ہے کہ یہ پشتو کی پہلی نثری نظم ہے:

خدایا
زہ هیس نہ غواڑم
نہ زر
نہ زمکہ
نہ ځکلے ځکلے جامے
نہ اوچت اوچت کورونہ
نہ لوئے لوئے باغونہ
بس یوشے غواڑم
یوشے
یو پلوشہ دا ایمان[۲۳]

ترجمہ

خدایا
میں کچھ نہیں مانگتا
نہ زر
نہ زمین
نہ خوب صورت جامے
نہ اونچے اونچے گھر
نہ بڑے بڑے باغ
بس ایک شے مانگتا ہوں
فقط ایک شے
ایک کرن ایمان کی

انور رومان کی نثری نظموں کا یہ پہلا تفصیلی مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی نظمیں نثری نظم کی تعریف پر پورا اترتی ہیں۔ وہ ساٹھ کی دہائی میں سامنے آنے والے نثری نظم کے چند اوّلین شعرا میں شامل ہیں[۲۴]۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ اردو کے ادبی حلقوں میں وہ اپنی زندگی میں نثری نظم کے شاعر کے طور پر پہچانے گئے، نہ بعد از مرگ انھیں ان کا جائز مقام دیا گیا ہے۔ اس میں کچھ قصور ان کا اپنا بھی ہے، کہ خود انھوں نے اپنی تخلیقات کو نہ صرف نثری نظم کے طور پر پیش نہیں کیا، بلکہ وہ ان سے ایک ناروا غفلت بھی برتتے رہے۔ اپنی کتاب رومانیے کے پیش لفظ میں وہ اپنی نظموں اور دیگر تخلیقات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> میں اپنے منصبی فرائض سے فارغ ہو کر مضمون، افسانے، ڈرامے وغیرہ لکھنے کا عادی تھا اور انھیں لکھ لکھ کر ایسے ہی الماری میں پھینکتا رہتا تھا کہ فرصت ملنے پر انھیں دوبارہ دیکھوں گا۔ لیکن روزمرہ کے چار لیکچر دے کر نظر ثانی کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ اور اگر کبھی وقت ملتا تو وہ کسی نئے مضمون وغیرہ پر صرف ہو جاتا۔ انعام الحق میری ان تمام تحریروں کو سنبھالتا رہتا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میری بہت سی تحریریں ضائع ہو جاتیں[۲۵]۔

گویا یہ نظمیں اگر مطبوعہ صورت میں سامنے آپائی ہیں تو اس کا سہرا ان کے بھائی انعام الحق کوثر کے سر ہے، ورنہ خود انھوں نے ان نظموں کو نابود کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اپنی تخلیقات سے غفلت روا رکھتے ہوئے انھوں نے اپنی کتب کو نثری نظم کی بجائے نثر لطیف کے طور پر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین کی ایک بڑی تعداد ان کتب سے بے خبر رہی اور اگر ان کا مطالعہ ہوا بھی تو وہ نثر لطیف کے زمرے میں کیا گیا۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ بلوچستان میں اردو نثری نظم کے پہلے

باقاعدہ شاعر ہیں، بلکہ پنجابی اور پشتو نظموں کے باعث انھیں نثری نظم کا پہلا ذولسانی شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ نثری نظم کی روایت میں ان کا ایک بڑا انفراد یہ ہے کہ انھوں نہ صرف بلوچستان کے طرز احساس کو اردو شاعری میں ڈھالا، بلکہ یہاں کی مختلف زبانوں کی لفظیات کے استعمال سے اردو شاعری کے لسانی دائرے کو وسعت دینے، بلوچستان کی شعری روایت کو ایک نئی صنف سے روشناس کرانے، اور اسے عوام میں مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اردو شاعری کو بلوچستان کی بو باس سے آشنا کرنے والے اوّلین شعرا میں سے ہیں، اب اگر یہ ایک اہم رجحان بن چکا ہے تو بلاشبہ انور رومان اس رجحان کے بانی نہ بھی ہوں تو اس کے مجتہدین میں سے ضرور ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ:۱۹۷۵ء)اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ انٹر کالج، برشور، بلوچستان۔

۱۔ احمد ہمیش، ”نثری شاعری کا ماخذ“، مشمولہ ادبیات، شمارہ ۷۷-۷۸(اسلام آباد: اکتوبر ۲۰۰۷-مارچ ۲۰۰۸)، ۲۵۶۔

۲۔ ناصر عباس نیر، متن، سیاق اور تناظر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ۲۳۰۔

۳۔ بلوچستان کے معروف نقاد فاروق احمد (۱۹۵۴ء-۲۰۱۰ء) کی کتاب بلوچستان میں اردو زبان و ادب (۱۹۹۸ء) میں انور رومان کے افسانے، ڈرامے اور مضمون نگاری کا تعارف شامل ہے مگر ان کی شاعری کا ذکر تک نہیں ہے۔ اسی طرح جواں مرگ شاعر اور نقاد دانیال طریر (۱۹۸۰ء-۲۰۱۵ء) کی کتاب بلوچستانی شعریات کی تلاش (۲۰۰۹ء) میں بھی انور رومان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ شمیم کوثر کی کتاب بلوچستان میں اردو نظم (۲۰۱۳ء)، جو دراصل ایم افل کا تھیسز ہے، میں انور رومان کا ذکر ضمناً آیا ہے۔ اسی طرح قندیل بدر کے پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے بلوچستان میں اردو نظم کا فکری و فنی مطالعہ (۲۰۲۰ء) میں انور رومان کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ حال ہی میں اکادمی ادبیات پاکستان نے نثری نظم کے انتخاب پر مشتمل ایک کتاب بہ عنوان پاکستان میں اردو نثری نظم (۲۰۲۲ء) شائع کی ہے۔ اس میں انور رومان سمیت بلوچستان کے کسی شاعر کا کلام شامل نہیں ہے۔

۴۔ انعام الحق کوثر، بلوچستان میں تذکرۂ اردو (کوئٹہ: ادارہ تصنیف و تحقیق، ۲۰۰۶ء)، ۱۳۔

۵۔ علی کمیل قزلباش، رگ تاک (کوئٹہ: قلات پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ۲۰۔

۶۔ بلوچستان میں اگرچہ گزشتہ صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں متعدد لکھنے والوں نے اردو میں افسانہ لکھنے کی سعی کی ہے۔ تاہم وہ زیادہ تر نیم پختہ، تمثیلی اور ماخوذ کہانیاں ہیں، یہ افسانے کی تعریف پر پورا نہیں اترتیں۔ اس مقالہ نگار نے اپنے پی ایچ ڈی کے ہنوز غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے بہ عنوان بلوچستان میں اردو کا نثری ادب (۲۰۱۹ء) میں دستیاب شواہد کی بنا پر انور رومان کو بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔

۷۔ انعام الحق کوثر کو بلوچستان میں اردو تحقیق و تدوین کا بنیاد گزار کہا جاتا ہے۔ وہ کئی کتب کے مصنف و مؤلف ہیں۔ ان کی چند اہم اور معروف کتب کے نام یہ ہیں:

بلوچستان میں نفاذِ اردو (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۶۸ء)۔

بلوچستان میں فارسی شاعری (کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی، ۱۹۶۸ء)۔

جوہر معظم (مرتبہ) (کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی، ۱۹۶۹ء)۔

جوئے کوثر (کوئٹہ: بابر پبلشرز، ۱۹۷۶ء)۔

تذکرہ صوفیائے بلوچستان (لاہور: مجلس ترقی اردو، ۱۹۷۶ء)۔

کلیات محمد حسن براہوی (مرتبہ) (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء)۔

مکاتیب یوسف عزیز مگسی (مرتبہ) (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۸ء)۔

بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات (مرتبہ) (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)۔

علامہ اقبال اور بلوچستان (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء)۔

جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار (لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۹۱ء)۔

بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تقابلی مطالعہ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء)۔

۸۔ خلیل صدیقی، قمقمے (کوئٹہ: قلات پریس، ۱۹۷۷ء)، پس ورق۔

۹۔ انور رومان، انواریے (کوئٹہ: سیرت اکادمی بلوچستان، ۲۰۰۰ء)، ۸۔

۱۰۔ انور رومان، قمقمے (کوئٹہ: قلات پبلشرز، ۱۹۷۷ء)، ۳۰۔

۱۱۔ ایضاً، ۵۸۔ (انھوں نے مہاتما بدھ کے ایک قول کو نظمایا ہے)۔

۱۲۔ انور رومان، قمقمے، ۴۲۔

۱۳۔ ایضاً، ۹۶۔

۱۴۔ ایضاً، ۶۰۔

۱۵۔ انور رومان، انواریے، ۱۱۔

۱۶۔ ایضاً، ۱۲۳-۱۲۴۔

۱۷۔ ایضاً، ۵۱

۱۸۔ انور رومان، قمقمے، ۶۳-۶۴۔

۱۹۔ انور رومان، انواریے، ۶۹-۷۰۔

۲۰۔ ایضاً، ۵۵۔

۲۱۔ مبارک احمد، کلیات مبارک (لاہور: مبارک پبلشرز، ۱۹۹۹ء)، ۵۴۔

۲۲۔ انور رومان، انواریے، ۱۵۸۔

۲۳۔ ایضاً، ۱۶۰۔

۲۴۔ انور رومان کی کتاب رومانیے کے پیش لفظ میں انعام الحق کوثر لکھتے ہیں کہ انور رومان نے ۱۹۳۹ء کے زمانے (قریباً پندرہ سال کی عمر میں) میں قمقمے اور انواریے کی طرز کی پہلی تحریر لکھی تھی جو کہ جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸ء-۱۹۸۲ء) کے پرچے کلیم دہلی میں چھپی تھی۔ ریختہ کی ویب سائٹ پر کلیم کے چند پرچے دست یاب ہیں مگر ان میں یہ مطلوبہ پرچہ شامل نہیں۔ تاہم اگر یہ روایت درست ہے تو انور رومان بلوچستان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی نثری نظم کے پہلے شاعر قرار پاتے ہیں۔

۲۵۔ انور رومان، رومانیے، ۱۳۔

Bibliography

Ahmad, Farooq. *Balūchistān meiṅ Urdū Ẓabān-o-Ādab*. Quetta: Kalāt Publishers, 1998.
Ahmad, Mubarak. *Kūlīyāt-i Mubārak*. Lahore: Mubārak Publishers, 1999.
Hamesh, Ahmad. "Naśarī Shā'ri Kā Mākhiẓ", in *Ādābīyāt*, no. 77-78. Islamabad: Oct 2007- March 2008. 256.
Kausar, Inam ul Haq. *Balūchistān meiṅ Taẓkarah-i ū*rdu. Quetta: Idarah-i Tehqīq-o-Taṣnīf, 2006.
Nayyar, Nasir Abbas. *Matan, Sīyāq aur Tanāẓur*. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2016.
Qazalbash, Ali Kumail. *Rag-i Tāk*. Quetta: Kalāt Publishers, 2010.
Rumaan, Anwar. *Ānwāriyē*. Quetta: Serat Academy Balūchistan, 2000.
Rumaan, Anwar. *Qumqumē*. Quetta: Kalāt Publisher, 1977.
Rumaan, Anwar. *Rūmāniyē*. Quetta: Serat Academy Balūchistan, 2001.
Zaheer, Sajjad. *Pighlā Nīlam.* Karachi: Maktabah-i Dāniyāl, 2005.